POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 24-25 May 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

HAMARI
ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان

اشاعت کا 87 واں سال

Date of Publication: 23-05-2026 • Price: 5/- • 1-7 June 2026 • Issue: 21 • Vol:85

یکم تا ۷ جون ۲۰۲۶ء • شمارہ:۲۱ • جلد:۸۵

اُردو شاعری میں عشقِ حقیقی کا تصوّر

پروفیسر منظر حسین

ادب انسانی زندگی کا حسین ترجمان، اس کے افکار کا پرتو اور اس کے خیالات کا عکس ہوتا ہے۔ لہٰذا ادب اور زندگی کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عالمی ادب میں کوئی بھی بڑا ادیب اور فنکار ایسا نہیں جس نے ادب کو زندگی کی بہتری کے لیے استعمال نہ کیا ہو۔ ادب کا وجود زندگی کے وجود پر موقوف ہے اور زندگی کا سب سے عظیم تصور خدا کا تصور ہے۔ خدا کے تصور کے بغیر اعلا شعر و ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔ تعمیری ادب کی فکری اساس کے اس بنیادی تصور کو ہم 'ذوقِ عبودیت' سے موسوم کر سکتے ہیں جو ہماری زندگی کو ایک نیا نشاط، نئی قوت اور نئی توانائی بخشتا ہے۔ طاعت و بندگی کا یہ تصور انسان میں یقین کی روشنی اور ایمان کی حرارت پیدا کرتا ہے۔ ایک شاعر و ادیب جب اس یقین و ایمان سے معمور ہو جاتا ہے تو اس کا سینہ روشن اور قلب ضیا بار بن جاتا ہے جس کے نتیجے میں اس کی تخلیق سے علم و عرفان اور رشد و ہدایت کی ایسی شعاعیں پھوٹتی ہیں جو ذہنوں کو منور کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کے لیے حیات آفریں، باعث سکون و مسرت اور وجہ بصیرت و برکت ثابت ہوتی ہیں۔ طاعت و بندگی کا یہی جذبہ و عمل ابن آدم کے جسم خاکی میں سوز و ساز، درد و داغ اور تب و تاب بخشتا ہے۔ اسی کیفیت کا دوسرا نام 'عشق' ہے۔ تخلیق کائنات اور حیات انسانی کے ارتقا میں عشق اور معاملات عشق کو ایک بنیادی اور کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ لہٰذا عشق کا جذبہ باعث ایجاد عالم بھی ہے اور مقصد ہستی کے حصول کا ذریعہ بھی۔ عشق ہی کی بدولت انسان کو اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ یہ کائنات اس کے اور صرف اسی کے لیے تخلیق کی گئی ہے۔ عشق وہ نعمت کبریٰ ہے جو یقین کا راستہ دکھاتی ہے۔ زندگی کو با مقصد بناتی ہے اور مردِ مومن میں الٰہی صفات پیدا کرتی ہے۔ اس میں ہوا و ہوس کا شائبہ تک نہیں۔ بقول خلیفہ عبدالحکیم:

> ''مسلمانوں کے یہاں صدیوں سے عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی کی اصطلاحیں زبان زد عام ہیں۔ عشقِ حقیقی سے بعض اوقات انسانوں کی باہمی بے لوث محبت مراد ہوتی ہے جس میں خود غرضی، نفسیات یا جنسیت کا کوئی شائبہ نہ ہو اور بعض اوقات اس کے معنی عشق الٰہی ہوتے ہیں یعنی اشخاص و اشیا کی محبت کے ماورا خدا کا عشق اور عشقِ حقیقی دل میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان کا دل ہر قسم کی حرص و ہوس سے پاک ہو جائے۔
>
> سرمد غم عشق بوالہوس را نہ دہند
> سوز دل پروانہ مگس را نہ دہند''

(فکرِ اقبال، خلیفہ عبدالحکیم، ص216)

'عشق' کی اصطلاح کو عالمگیر قوت حیات کے معنی پہنانے اور عشق کو ایک مستقل نظام فلسفہ کی بنیاد بنانے کا سہرا مشہور اسلامی فلسفی بوعلی سینا کو ہے، جنھوں نے اپنے رسالہ ''عشق'' میں عشق کا ایک منظّم فلسفیانہ تصور پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''عشق ایک عالمگیر جذبہ حیات ہے جو حیات کے نباتی اور حیوانی مدارج سے لے کر انسان کے روحانی ارتقا تک ہر سطح پر حرکت اور ارتقا کے محرک جذبہ کی حیثیت سے کارفرما ہے''۔ (مشمولہ فلسفۂ عجم از اقبال، ص63-64)

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کا ہر عمل عشق کے جذبے سے معمور ہے۔ یہ ایک ایسا آفاقی جذبہ ہے جس کی وسعتیں زمان و مکان کی پابند نہیں۔ عشق سکون و طمانیت کا ضامن بھی ہے اور خدا کی معرفت کا ذریعہ بھی اور خالق حقیقی کے قرب کا وسیلہ بھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ترجمہ:

> ''اے اطمینان والی روح تو اپنے رب کی طرف لوٹ چل، اس طرح کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے خوش، پس میرے خاص بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں چلی جا''۔
>
> (الفجر، آیت 27-30)

اس آیتِ کریمہ میں 'مطمئنّہ' سے مراد وہ نفس ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی اطاعت سے سکون و قرار پاتا ہے اور اس کے ترک سے بے چینی محسوس کرتا ہے۔ رب حقیقی مذکورہ آیت میں اپنے لیے واحد متکلم کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے خود صاحب عشق کو اپنی قربت کا احساس دلاتا ہے۔ عشق اور معاملاتِ عشق انسان کا خمیر ہے اور جبلت بھی۔ عشق مقصدیت اور حرکت و عمل کا اشاریہ بھی ہے اور انقلاب کا داعی بھی۔ مجھے چوں کہ 'اردو شاعری میں عشق حقیقی کا تصور' پر گفتگو کرنی مقصود ہے لہٰذا میں اسی موضوع کے تحت اپنی باتوں کو مختص رکھوں گا۔ غزل کی شاعری میں عشق حقیقی کی چاشنی سب سے پہلے ولؔی کے دیوان میں محسوس ہوتی ہے۔ ولؔی نے تصوف کو اپنی زندگی کا ماحصل بنایا۔ تصوف نے ہماری غزل کی شاعری کو ایک ذہنی بنیاد اور خام مواد فراہم کیا ہے۔ وحدت الوجود کا نظریہ اس زمانے میں ایک عمومی اور صوفی شعرا کے نزدیک مقبول ترین نظریہ تھا۔ ہر سمت خدا ہے اور خدا کے سوا کچھ نہیں۔ ہر شے میں خدا ہے اور خدا کے سوا کچھ نہیں۔ ولؔی بھی وحدت الوجود کے نظریے کے شدت سے قائل رہے۔ ان کے کلام میں اس کی جلوہ گری دیکھنے کو ملتی ہے۔ دیکھیے یہ اشعار:

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا
بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا
ہوا ہے مجھ کو شمع بزمِ یک رنگی سوں یوں روشن
کہ ہر ذرہ اوپر تاباں ہے دائم آفتاب اس کا

ولؔی کے یہاں عشق کا تصور صرف حقیقی ہے۔ وہ عشق جو خدا کی قربت، تہذیب نفس اور تزکیہ و تالیف قلب کا وسیلہ بنتا ہے۔ وہ اس عشقِ تصور کے علمبردار نہیں جس میں عاشق فنا فی اللہ کے مقام کو حاصل کر لے۔ دیکھیے یہ اشعار:

عشق میں لازم ہے اول ذات کو فانی کرے
ہو فنا فی اللہ دایم یاد یزدانی کرے

______

خود فنا ہو کے ذات میں ملتا
یہ تماشا حباب میں دیکھا

______

خودی سے اولاً خالی ہو اے دل
اگر اس شمع روشن کی لگن ہے

دکن کے معروف شعرا میں ایک بڑا نام سراؔج اورنگ آبادی کا ہے۔ انھوں نے اردو شاعری میں تصوف کو ایک نئے افق اور نئی رفعت عطا کی۔ ان کی مشہور غزل جس کا مطلع ہے:

خبر تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

عشقِ حقیقی کے مسئلے کی جامع اور وقیع تصویر ہے۔ پہلے مصرع میں زور

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقی اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کر سکتے ہیں جہاں اسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

عشق پر اس قدر نہیں جتنا اس تحیر پر ہے جو عشق کی کیفیت سے منسلک اور اس کا پروردہ ہے۔ پہلے مصرع میں 'تحیرِ عشق' اور دوسرے مصرع میں 'بے خبری' ایک ہی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ کیفیت نتیجہ ہے دو الگ الگ اکائیوں کے تحلیل ہوجانے یعنی 'تو' اور 'میں' کے تشخص کے ختم ہوجانے کا۔ یہاں طالب اور مطلوب، موضوع اور معروض ایک دوسرے میں ضم ہوکر اپنی انفرادیت کھودیتے ہیں۔ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے 'عشق' کی توضیح کرتے ہوئے اپنے رسالے 'اسماء الاسرار' میں لکھا ہے:

''عشق خواجۂ جہاں ہے، عشق کی کوئی صورت نہیں، عشق ہر صورت میں ظاہر و پنہاں ہے، عشق رحیم و رحمان ہے، عشق ہی بت پرست ہے، عشق ہی بت شکن ہے، عشق خدا سے جدا نہیں''۔

سراج اسی عشق کے علمبردار تھے اور اپنی شاعری میں اسی عشقیہ کیفیات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ دیکھیے یہ اشعار:

سراج یہ مجھے استاد مہرباں نے کہا
کہ علم عشق سیں بہتر نہیں ہے کوئی علوم

———

گر حقیقت کی سیر ہے خواہش
راہ عشق مجاز لازم ہے

عشق میں فنا ہوجانا عاشق کی بقا کی ضمانت ہے۔ نیستی ہی ہستی ہے جو انسانی صفات کو مٹا کر ممکنہ حد تک صفات الٰہیہ پیدا کرتا ہے۔ دیکھیے یہ اشعار:

جل گیا عشق کے شعلوں میں سراج
اپنی دانست میں بے جا نہ کیا

———

تو فنا ہو اگر بقا چاہے
نیستی میں تو دیکھ ہستی ہے

دہلی کے شعرا میں عشق حقیقی کا رنگ میر تقی میؔر کے یہاں اور نکھر آیا ہے۔ میؔر بچپن میں ہی یتیم ہوگئے تھے لیکن اس سے قبل ان کے والد ان پر عشق کی بڑائی اور فضیلت کو اکثر واضح کیا کرتے تھے۔ میر کو انھوں نے ایک نصیحت کی تھی:۔

''اے بیٹا عشق اختیار کرو۔ عشق ہی اس کارخانے میں متصرف ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو نظم کل کی صورت نہیں ہوسکتی۔ عشق کے بغیر زندگی وبال ہے۔ دل باختہ عشق ہونا کمال کی علامت ہے۔ سوز و ساز دونوں عشق سے ہیں۔ عالم میں جو کچھ ہے وہ عشق کا ہی ظہور ہے۔ آگ میں عشق سے ہی سوزش ہے اور پانی میں عشق سے ہی روانی ہے۔ خاک میں عشق کا قرار ہے اور ہوا میں اس کا اضطراب ہے۔ موت عشق کی مستی ہے اور زندگی اس کی ہوشیاری۔ دن عشق کی بیزاری اور رات اس کی نیند ہے۔ مسلمان عشق کا جمال اور کافر اس کا جلال ہے۔ نیکی اس کا قرب اور گناہ اس کی دوری ہے۔ عشق کا مقام و مرتبہ بندگی ہے، زہد، سچائی اور خلوص سے اشتیاق اور وجدان سے بھی بلند و بالا ہے''۔

(بحوالہ ذکرِ میر، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، 1928، ص 60-59)

میؔر کی غزلیہ شاعری میں عشق و محبت کے موضوعات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ یہ موضوع ان کی شاعری میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ میر کہتے ہیں:

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق
عشق ہے طرز و طور عشق کے تئیں
کہیں بندہ کہیں خدا ہے عشق
عشق معشوق عشق عاشق ہے
یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب 'تاریخِ ادبِ اردو' میں میؔر کی عشقیہ شاعری کو دو دائروں میں منقسم کیا ہے۔ پہلا دائرہ عشق حقیقی کا ہے جہاں عشق تمام کائنات پر حاوی ہے۔ دوسرا جو چھوٹا دائرہ عشق مجازی کا ہے، جو بڑے دائرے کا ہی ایک حصہ ہے، اس سے الگ نہیں۔ دیکھیے یہ اقتباس:

''میر کے یہاں عشق کے دو دائرے ہیں۔ ایک بڑا دائرہ اور دوسرا اس دائرے کے اندر ایک چھوٹا دائرہ۔ بڑا دائرہ وہ ہے جو کل کو محیط ہے۔ یہاں عشق ساری کائنات پر حاوی ہے۔ عشق ہی روح کائنات ہے... اس تصور عشق کا تعلق اس مابعد الطبیعیات سے ہے جس نے خدا، کائنات اور اس کے رشتوں کو واضح دائروں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اس سے وہ علویت پیدا ہوتی ہے جو معراج انسانیت ہے۔... میؔر کے نزدیک عشق ہی خالق عشق ہی خلق اور عشق ہی باعث ایجاد خلق ہے''۔

(بحوالہ تاریخ ادب اردو، جلد دوم 1984، ص 79-577)

میؔر کے یہاں مشاہدات کی رعنائی اور محسوسات کا جو رچاؤ ہے، ان کے ذاتی تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان میں تجربات عشق بھی شامل ہے جن میں رنگارنگی بھی ہے اور وسعت اور گہرائی بھی۔ بقول شمس الرحمان فاروقی:

''عشق کا تجربہ میؔر کی شاعری کا مرکزی نکتہ ہے''۔

میؔر کی عشقیہ شاعری کا پہلا دائرہ جس کا تعلق عشق حقیقی سے ہے، اس میں تصوف کے رموز و نکات بھی ہیں اور انسانی رشتوں کا احساس بھی۔ اضطراب میں صبر و تحمل بھی ہے اور غم کا عرفان بھی۔ اس سلسلے میں ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو جس میں عشق کی عظمت اور حقائق کی گرہ کشائی جلوہ گر ہے:

طریق عشق میں ہے رہنما دل
پیمبر دل ہے، قبلہ دل، خدا دل

'وحدت الوجود' اور 'وحدت الشہود' تصوف کی دو اہم اصطلاحیں ہیں۔ ان دونوں اہم نظریات نے یقیناً فہم و شعور، علم و ادراک کے مختلف دریچے وا کیے ہیں اور تدبر و تفکر کا موقع فراہم کیا ہے۔ میر کے یہاں وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں طرح کے اشعار ملتے ہیں:

گل و آئینہ و خورشید و ماہ کیا
جدھر دیکھا ادھر تیرا ہی رو تھا

———

عالم آئینہ ہے جس کا وہ مصور بے مثل
ہائے کیا صورتیں پردہ میں بناتا ہے میاں

———

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

———

گل و رنگ و بہار پردے ہیں
پر عیاں میں ہے وہ نہاں تک سوچ

مجھے کہنے دیجئے کہ میر کے یہاں جو مضامین عشق حقیقی یا تصوف کے حوالے سے بیان کیے گئے ہیں وہ پیداوار ہیں ان کی دروں بینی، تجسسانہ اور قلندرانہ مزاج کے۔ دنیا کی بے ثباتی پر میر کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

اخلاقی اور حکیمانہ مضمون کو کس فکرانگیز اور دلنشیں پیرایے میں نظم کیا ہے۔ ملاحظہ ہو یہ شعر جس میں استغنائی کیفیت بھی ہے اور دردمند دل کا گداز بھی:

نہ مل اب کے اے میر امیروں سے تو
ہوئے ہیں فقیر ان کی دولت سے ہم

اردو شاعری کی تاریخ اور بالخصوص متصوفانہ شاعری میں خواجہ میر درد کو بلند اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ وہ صوفیانہ کیفیت کا ذاتی تجربہ رکھتے تھے۔ ان کی صوفیانہ شاعری میں انسانی زندگی کی بے ثباتی کا نوحہ بھی ہے اور مظاہر کی کثرت میں وحدت کا ثبات بھی۔ حقیقت تک پہنچنے کے متضاد راستے کا بیان بھی ہے اور عدم و وجود کے رشتے کا عرفان بھی۔ عشق حقیقی کے حوالے سے ان کے یہاں کئی موضوعات ملتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں بے ساختگی تو ہے لیکن ان کے ذاتی تجربات کے مرہون منت بھی ہیں۔ درد کے یہاں وحدت الوجود کے عقیدے کو بھی کلیدی حیثیت حاصل ہے:

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

———

وحدت نے ہر طرف تیرے جلوے دکھا دیے
پردے تعینات کے جو تھے اٹھا دیے
ہوں کشتۂ تغافل ہستی بے ثبات
خاطر سے کون کون نہ اس نے بھلا دیے

———

آئینہ عدم ہی میں ہستی ہے جلوہ گر
ہے موجزن تمام یہ دریا حباب میں

دردؔ کے مذکورہ اشعار میں اعتدال، ایک خوشگوار استحکام جھلکتا ہے۔ پہلے شعر میں تیقن بھی ہے اور مشاہدہ کی نازکی اور ایمانی قوت بھی۔ اگلے دو شعر میں مظاہر کی نیرنگی نے حقائق کی گرہ کشائی کو تقویت بخشی ہے۔

اردو کے جن شعرا کی غزلوں میں عشق حقیقی اور تصوف کے رموز و نکات کو اجاگر کیا گیا ہے ان میں ایک بڑا نام غالب کا بھی ہے۔ خصوصاً غالب کے فکری نظام میں وحدت الوجود کے نظریے کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ وہ اس نظریے کے مؤید ہیں کہ ہر شے کی حقیقت ایک ہی ہے اور تمام اشیا ایک ہی ذات کے مظہر ہیں۔ کائنات خدا سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتی۔ ان کے نزدیک فنا کی راہ ہی اشیاے عالم کی شیرازہ بندی کا ضامن ہے۔ دیکھیے یہ اشعار:

عشرت خطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا

———

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

غالبؔ ہر شے کی حقیقت کو ایک ہی ذات کا مظہر گردانتے ہیں:

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

دبستانِ لکھنؤ کے نمائندہ شعرا میں خواجہ حیدر علی آتش کا نام اہم بھی ہے اور نمایاں بھی۔ آنکھوں کا کاجل، سرمے کی سیاہی، غازے کی سفیدی، مہدی کی سرخی، چوڑیوں کی کھنک، پازیب کی جھنک، دبستان لکھنؤ کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ آتش کی شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، لیکن یہ بھی ایک سچائی ہے کہ آتش کی شاعری میں ہمیں تصوف کے مختلف جہات ملتے ہیں۔ ان کی صوفیانہ شاعری کی سب سے بڑی شناخت یہ ہے کہ اس میں نہ فلسفیانہ بلند آہنگی ہے اور نہ جذبات کی شدت۔ ان کے یہاں عشق حقیقی یا تصوف کے اشعار کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ وہ داخلیت کے حصار سے آزاد ہوں۔ ان کی صوفیانہ شاعری مذہب کی ظاہرداریوں کے خلاف احتجاج بھی ہے اور دنیوی شان و شوکت، جاہ و حشمت کی طرف استغنائی مزاج کا اشاریہ بھی۔ لہٰذا ان کی صوفیانہ شاعری کا مطالعہ لکھنؤ کی اجتماعی زندگی کے محرکات کے پس منظر میں کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ درجِ ذیل اشعار دیکھیں: ...(بقیہ صفحہ 6 پر)

ظفر کلیم اور 'ایک نوائے حرفِ خموش'

محمد اسد اللہ

جب بھی ہم کسی ایسے شہر کا نام لیتے ہیں جو علم و ادب کی روایات کا امین رہا ہو تو شعر و ادب کے حوالے سے چند نام ضرور یاد آتے ہیں۔ وسط ہند (مہاراشٹر) کے شہر ناگپور کے اہم شعرا میں ایسا ہی ایک نام ظفر کلیم بھی ہے۔ ظفر کلیم کئی دنوں کی علالت کے بعد 13 دسمبر 2024 کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے تھے۔

نرم لہجہ، مہذب طرزِ گفتگو اور وضع داری، غرض متاثر کرنے والے کئی عناصر ظفر کلیم کی شخصیت میں موجود تھے۔ ہر ملنے والے کو ان کا مخصوص انداز یہ باور کروانے کے لیے کافی تھا کہ یہ شخص عام لوگوں سے مختلف ہے۔ ہر ملاقات پرخلوص، شفقت و محبت کا اظہار ان کی شخصیت کو دل و دماغ میں بسا دیتا تھا۔ مشرقی تمدّن کی پہچان مخصوص تہذیب، شرافت رکھ رکھاؤ اور حسنِ اخلاق جیسی خوبیاں ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں رچی بسی ہوئی تھیں۔

ظفر کلیم کا اصل نام شمشیر خاں تھا، وہ 5 دسمبر 1938 کو ناگپور میں پیدا ہوئے۔ ایچ ایس سی ڈی ایڈ کرنے کے بعد اسلامیہ ہائی اسکول میں ملازمت اختیار کی۔ انھوں نے لائف انشورنس ایجنٹ کی حیثیت سے بھی کام کیا اور زمینوں کی خرید و فروخت کے میدان میں اتر کر بلڈر بن گئے۔ ناگپور کے علاقۂ چھاؤنی میں واقع ظفر کلیم کا تعمیر کردہ 'غزل اپارٹمنٹ' ان کے ادبی ذوق کا ضامن ہے۔ ظفر کلیم کی ابتدائی زندگی ایک آسودہ حال گھرانے میں بسر ہوئی لیکن ان کے والد کے انتقال کے بعد انھیں مختلف پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، ان میں ظفر کلیم کی اہلیہ اور جوان بیٹے کی رحلت بھی شامل ہے۔ انھوں نے ان مصائب کا صبر و تحمل کے ساتھ مقابلہ کیا۔ ان کی شاعری میں ان سانحات اور زندگی کی جدوجہد کی جھلکیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ ظفر کلیم اپنی زندگی کے آخری دور میں سماجی طور پر مشہور شخصیات کے رابطے میں رہے۔ ان کا کلام مختلف ذرائع سے اور مشاعروں کے توسط سے مقبولیت حاصل کرتا گیا۔

ظفر کلیم نے 1953 سے شاعری شروع کی جب ان کی عمر صرف پندرہ برس تھی۔ ان کی پہلی غزل ادبی رسالے 'پیامِ نو' میں شائع ہوئی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'طلسمِ غزل' 1981 میں اور دوسرا شعری مجموعہ 'نوائے حرفِ خموش' 2007 میں منظرِ عام پر آیا۔ 'نوائے حرفِ خموش' 472 صفحات پر مشتمل ہے جس میں گیارہ پابند، معریٰ اور آزاد نظمیں اور غزلوں کے علاوہ قطعات بھی شامل ہیں۔ ظفر کلیم کے دوسرے مجموعۂ کلام 'نوائے حرفِ خموش' کی اشاعت سے پہلے اس کے دو بار گم ہونے کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔ اس کتاب کی ابتدا میں ظفر کلیم نے اپنے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے اپنے مضمون 'سرنامۂ ماضی و حال' میں اس کی تفصیلات پیش کی ہیں۔

> ''تبدیلیِ مکان کے درمیان کچھ ذہنی الجھنوں اور کچھ لاپروائی کے سبب نوائے حرفِ خموش' کا مسودہ کہیں چھوٹ گیا، مگر مسودہ کی زیراکس کاپی کے سبب حوصلہ نہیں ٹوٹا لہٰذا از سرِ نو مسودہ تیار کرنا شروع کیا''۔

دوسری مرتبہ ممبئی سے ناگپور ٹرین میں سفر کرتے ہوئے جو حادثہ پیش آیا اس کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''بس ایک ہی بات ذہن میں تھی کہ ناگپور پہنچتے ہی مسودہ پریس کے سپرد کر کے فوراً اشاعت کا کام شروع کروا دوں گا کہ آنکھ لگ گئی اور صبح 6 بجے سے کچھ پہلے آنکھ کھلی تو یہ دیکھ کر آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا کہ سوٹ کیس اپنی جگہ پر نہیں ہے۔ زنجیر کھینچی، گاڑی رکی، تلاش کیا لیکن سوٹ کیس نہیں ملا''۔

اس سانحے نے انھیں ذہنی طور پر بری طرح متاثر کیا، یہ ان کے لیے کسی عزیز کی موت سے کم نہیں تھا۔ چند دنوں بعد پھر ان کے دوسرے شعری مجموعے کی تیاری کی سبیل نکل آئی، اس کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''سوچ لیا تھا کہ اب مکمل طور پر شاعری ہی ترک کر دوں گا کہ ایک دن اچانک ایک گٹھے میں بندھے ہوئے ردی پیپرس الٹ پلٹ رہا تھا کہ 'نوائے حرفِ خموش' میں شامل غزلیات کے مصرعوں کی فہرست ملی تو یوں لگا کہ جیسے میرے بے جان حوصلوں میں جان پڑ گئی۔ خدا کا شکر ادا کیا اور ایک بار پھر بسم اللہ کہہ کر تیسری بار اپنے دوسرے شعری مجموعے 'نوائے حرفِ خموش' کی تیاری میں جی جان سے جٹ گیا۔ جتنے اشعار یاد آتے لکھتا اور باقی نئے اشعار کہہ کر غزل پوری کرتا۔ غرض کہ سیکڑوں اشعار نئے کہے طبعِ موزوں نے بھی خوب ساتھ دیا اور اللہ کی جانب سے اس طرح غیبی مدد ہوئی کہ محض تقریباً ڈھائی سال کے مختصر سے عرصے میں نوائے حرفِ خاموش کا نیا ضخیم مسودہ گم شدہ دونوں ہی مسودوں سے میرے تئیں بہتر ثابت ہوا''۔[1]

ظفر کلیم کی شاعری میں غزل کے روایتی موضوعات کے علاوہ زندگی کے نئے مسائل اور عہدِ حاضر کے وہ موضوعات بھی شعری اظہار کا مرکز بنے ہیں جنھیں جدید شاعری نے متعارف کروایا۔ ان کے متعلق ڈاکٹر آغا غیاث الرحمان لکھتے ہیں:

> ''ظفر کلیم اپنے ہم عصروں میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ ان کا شعری اسلوب سب سے جداگانہ اور منفرد ہے۔ انھوں نے شاعری میں نئی نئی راہیں اور جہتیں نکالی ہیں۔ نئی علامتوں اور استعاروں سے اپنے اشعار میں زور اور نیا پن پیدا کیا ہے۔ انھوں نے تمام اصناف میں شعر کہے ہیں، لیکن غزل ان کی پسندیدہ صنف ہے''۔[2]

ظفر کلیم کا کلام روایتی شاعری سے جدیدیت کی طرف سفر کا ایک سلسلہ ہے، جس زمانے میں انھوں نے طبع آزمائی شروع کی ناگپور میں پیرِ مغاں خمخانۂ سخن مولانا ابوالحسن ناطق اور ضمیر الشعرا امین الفن حضرت طرفہ قریشی اپنے اپنے تلامذہ کے ساتھ پرورشِ لوح و قلم کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ ظفر کلیم نے صوفی شاعر ڈاکٹر عبدالحمید خاں آذر سے شاعری کی تربیت حاصل کی اور علم و ادب کے رموز سیکھے۔ مشاعروں میں ہونے والی ہوٹنگ، نوک جھونک اور روایتی شاعری کے عروج کے اس زمانے میں منظور حسین شور جیسے شاعر بھی یہاں موجود تھے جو ترقی پسند تحریک کے ہمنوا تھے۔ اسی کے ساتھ جدیدیت کی ہوائیں بھی ادیبوں اور شاعروں کے ذہنوں میں تخلیقی شگوفے کھلا رہی تھیں۔ ناگپور اور اس سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع شہر کامٹی جسے ناگپور کے ادبی منظر نامے کی توسیع کہا جا سکتا ہے، ان دونوں مقامات کے فنکار جدیدیت کے ان رجحانات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اُس وقت یہاں شاہد کبیر، مدحت الاختر، عبدالرحیم نشتر، س۔ یونس، غیور جعفری، ضیا انصاری، شریف احمد شریف، ڈاکٹر بدرِ جمیل وغیرہ موجود تھے۔ ان فنکاروں کا کلام ماہنامہ شب خون، کتاب، جواز، شاعر وغیرہ میں شائع ہونے لگا۔ اسی ادبی فضا میں ظفر کلیم نے اپنے مشاہدات، احساسات اور تجربات کو شعری پیکر عطا کئے۔ ظفر کلیم کی شاعری جدید رجحانات کے ساتھ اخلاقی قدروں کو بھی بہ حسن و خوبی پیش کرتی ہے۔ اس پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد لکھتے ہیں:

> ''تہذیب، شرافت، اخلاقیات جو ہمارے مشرقی معاشرے کا ایک اہم حصہ بن چکے ہیں، ان کی ترجمانی بھی بہت خوب صورت انداز میں ان کے کلام میں ملتی ہے۔ فنی سطح پر معتبر اور فکری سطح پر 'روحِ عصر' سے باخبر ظفر کلیم ہمارے ان شعرا میں ہیں جو ستائش کی تمنا سے بے نیاز ہو کر شعر و ادب کی خدمت کر رہے ہیں''۔[3]

اس خیال کی تصدیق ظفر کلیم کے ان اشعار سے ہوتی ہے:

بچا سکو تو بچا لو وجود کو اپنے
ضمیر بیچ کر جینے سے فائدہ کیا ہے

نادان یاد رکھ کہ عداوت وہ آگ ہے
بھڑکے تو بجھ نہ پائے گی پھر انتقام تک

اجسام بے ضمیر میں روحیں علیل ہیں
اس عہد میں بدن کی نفاست کے باوجود

> ''ظفر کلیم کے ہاں ندرتِ خیال ہے، وہ برتے ہوئے موضوعات کو نئے انداز سے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بقول حسن کمال ظفر کلیم کئی خرمنوں کے خوشہ چیں نظر آتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی ایسا خیال ڈھونڈ لائیں جو بالکل اچھوتا ہو۔ پامال موضوعات کو بھی اپنا لہجہ دے دینا ایک قابلِ قدر فن ہے اور ظفر کلیم کے یہاں یہ نیا پن مجھے کئی جگہ نظر آتا ہے''۔ (حسن کمال)

جب ملے رفیقوں سے زخم ہی ملے ہم کو
بے سبب رہا دل میں دشمنوں کا ڈر برسوں

سوال یہ ہے کہ خاموش کیوں ہیں لوگ اتنے
جواب یہ ہے سوالات کر کے دیکھتے ہیں

پیرہنِ تن پہ نہ جا جوہری
دام بتا گوہرِ نایاب کے

ظفر کلیم کی نظموں میں عصری زندگی کے مسائل کی گونج سنائی دیتی ہے ان کے ہاں ناانصافیوں اور بے اعتدالیوں پر احتجاج میں دردمند دل کی پکار موجود ہے۔ ان کی نظم 'فساد اور یکجہتی' میں فسادات کی تباہ کاریوں کی منظر کشی پوری شدت کے ساتھ ابھر آئی ہے۔ شاعر ان فسادات کے پیچھے کارفرما سیاست دانوں کی سازشوں کو گہرے دکھ کے ساتھ بیان کرتا ہے:

اس کے پیچھے ہے تعصب کی نوازش کا اثر
شہر در شہر ہے اس آگ کی سازش کا اثر

(بقیہ صفحہ 6 پر)

اردو دُنیا

اعلا تعلیم روشن مستقبل کے منصوبے سے اُردو غائب

پٹنہ (5 مئی)۔ نتیش کمار نے وزیرِ اعلا رہتے ہوئے جن سات عزائم-3 کے تحت ’اعلا تعلیم، روشن مستقبل‘ کا اعلان کیا تھا اُن سے بہار کی دوسری سرکاری زبان اور ریاست کے دو کروڑ سے زائد اقلیتی آبادی کی مادری زبان کو غائب کر دیا گیا ہے۔ یہ کام اردو جاننے اور اکثر اپنی گفتگو اور تقریروں میں اردو استعمال کرنے والے نائب وزیرِ اعلا وجے کمار چودھری کی ذمے داری والے محکمۂ اعلا تعلیم نے کیا ہے۔ دراصل محکمۂ اعلا تعلیم نے ریاست کے ان 208 بلاکوں میں ڈگری کالج کھولنے کے منصوبے کے تحت کل 16 مضامین میں درس و تدریس کی خدمات انجام دینے کے لیے پرنسپل سمیت 6656 اساتذہ کی تقرری کرنے کو کہا ہے، ان مضامین میں ہندی، انگریزی، معاشیات، تاریخ، علم نفسیات، جغرافیہ، علم سیاسیات، علم سماجیات، ہوم سائنس، ریاضی، علم طبیعیات، علم کیمیا، علم نباتیات، علم حیوانیات، کامرس اور علم ماحولیات شامل ہیں، لیکن اردو، فارسی اور عربی کا کوئی ذکر نہیں ہے، یعنی حکومت نے پچاس لاکھ فی کالج کے حساب سے 104 کروڑ روپے کی جو منظوری دی ہے اُس میں اردو اور اردو والوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

یاد رہے کہ محکمۂ اعلا تعلیم نے 30 اپریل کو 208 ڈگری کالجوں میں تدریسی اور غیر تدریسی عملے کے لیے جن 9152 عہدوں پر تقرری کرنے کے لیے جو 634 نمبر مکتوب جاری کیا تھا، اُس کے ٹھیک دو دن بعد یعنی 2 مئی کو یہاں جنتا دل یونائیٹڈ کے دفتر میں نائب وزیرِ اعلا وجے کمار چودھری نے پریس کانفرنس میں اقلیتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ریاست میں نئی حکومت بھی نتیش ماڈل کے مطابق ہی کام کرے گی۔ اب حکومت کے اس فیصلے سے اردو آبادی میں شدید غصہ ہے اور وہ اپنی حق تلفی کو کسی بھی صورت میں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اردو کونسل ہند کے صدر اور ’آموز‘ سے ایم ایل اے اختر الایمان نے ریاست کے 208 بلاکوں میں کھلنے والے نئے ڈگری کالجوں میں اردو کی تعلیم کا نظم نہ کرنے پر سخت اعتراض کیا ہے۔ انھوں نے اسے اردو کے ساتھ کھلی ناانصافی قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ بہار کی دوسری سرکاری زبان کے ساتھ یہ امتیازی سلوک کسی بھی طور پر قبول نہیں ہے۔ (انقلاب۔دہلی)

مسابقتی امتحانات کے لیے کتاب ’اردو ادب کی معلومات‘ کی اشاعت خوش آئند

حیدر آباد (4 مئی)۔ ماہرِ تعلیم و سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ ڈاکٹر محمد ناظم علی کی پندرہویں تصنیف ’اردو ادب کی معلومات‘ شائع ہوگئی ہے جو بالخصوص مسابقتی امتحانات کی تیاری کرنے والے طلبہ کے لیے نہایت اہم اور مفید قرار دی جا رہی ہے۔ یہ کتاب ایسے وقت میں منظرِ عام پر آئی ہے جب اردو میڈیم کے طلبہ کو مسابقتی امتحانات میں معیاری اور جامع مواد کی شدید کمی کا سامنا ہے۔ کتاب میں اردو زبان و ادب، صحافت، تعلیمی نفسیات اور تدریسی اصولوں سے متعلق ہزاروں معروضی سوالات اور ان کے درست جوابات ایک ہی جگہ فراہم کر دیے گئے ہیں۔ کتاب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تین ہزار سے زائد سوالات و جوابات کو مختصر، واضح اور امتحانی انداز میں پیش کیا گیا ہے تا کہ طلبہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر سکیں۔ سوالات کو موضوعاتی ترتیب کے بجائے متفرق انداز میں شامل کیا گیا ہے جس سے ذہنی مشق اور یادداشت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اردو مضمون اختیار کرنے والے امیدواروں کے لیے یہ کتاب ایک مکمل رہنما کا درجہ رکھتی ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی (پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج ظہیر آباد) نے اپنے پیش لفظ میں اس کتاب کو اردو کے معروضی مطالعے میں ایک اہم اضافہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ تصنیف طلبہ کے لیے معلومات کا بیش بہا خزانہ ثابت ہوگی۔ اسی طرح معروف کیری کونسلر ایم اے حمید نے بھی اس کتاب کو موجودہ دور کی ایک اہم تعلیمی ضرورت قرار دیا ہے۔ (رہنمائے دکن۔حیدر آباد)

غالب انسٹی ٹیوٹ میں یگانہ کی شخصیت، شاعری اور تنقید کے عنوان پر دو روزہ قومی سمینار اختتام پذیر

نئی دہلی (9 مئی، پریس ریلیز)۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام دو روزہ قومی سمینار بعنوان ’یگانہ: شخصیت، شاعری اور تنقید‘ اختتام پذیر ہوگیا۔ سمینار کے دوسرے دن چار تکنیکی اجلاس منعقد کیے گئے جن میں ملک کے نامور محققین اور نقادوں نے یگانہ کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں پر مقالات پیش کیے۔ پہلے اجلاس کی صدارت سابق صدر شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی پروفیسر سیّد حسن عباس نے کی۔ صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا کہ یہ امر خوش آئند ہے کہ اس سمینار میں پیش کیے گئے مقالات میں تکرار نہیں تھی۔ ان کے مطابق یگانہ پر منعقدہ کسی بھی علمی نشست میں اگر موضوعات میں تکرار ہو تو یہ خود یگانہ کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہوگا۔ اس اجلاس میں پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے ’یگانہ کی غالب شکنی‘، پروفیسر نصرت فاطمہ نے ’یگانہ اور غالب‘ جب کہ ڈاکٹر امیر حمزہ نے ’یگانہ کی رباعی گوئی‘ کے موضوع پر اپنے تحقیقی مقالات پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر انیس اشفاق نے کی۔ صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ یگانہ کو مظلوم شخصیت قرار دینا درست نہیں کیوں کہ ان کی مخالفت میں ان کے مزاج کو بھی دخل تھا۔ اس اجلاس میں پروفیسر شریف حسین قاسمی نے ’کلیات یگانہ‘ (مرتبہ مشفق خواجہ): ایک تحقیقی جائزہ‘، پروفیسر اخلاق احمد آہن نے ’یگانہ کی غالب شکنی‘، ڈاکٹر سبط حسن نقوی نے ’یگانہ کی پہلی کتاب‘ اور جناب فیض الرحمٰن نے ’یگانہ اور احساس تنہائی‘ پر مقالات پیش کیے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر ابوبکر عباد نے کی۔ انھوں نے کہا کہ یگانہ فہمی کی روایت ہمارے یہاں کبھی سست اور کبھی متحرک رہی ہے، تاہم یگانہ کا فن اپنی جگہ مضبوط ہے۔ اس اجلاس میں پروفیسر سیّد حسن عباس نے ’یگانہ کے خطوط دوارکا داس شعلہ کے نام‘ اور پروفیسر کوثر مظہری نے ’باقر مہدی کی یگانہ شناسی‘ پر مقالات پیش کیے۔ آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر کوثر مظہری نے کی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ یگانہ کی شاعری کو جب ان کے عہد کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے تو واضح ہوتا ہے کہ ان کی آواز اپنے زمانے میں منفرد تھی۔ نئی غزل کے ارتقا میں یگانہ کا کردار نہایت اہم ہے۔ انھوں نے جدید غزل کی سمت متعین کرنے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس اجلاس میں پروفیسر ابوبکر عباد نے ’یگانہ پر غالب کا اثر‘، ڈاکٹر قمر عالم نے ’یگانہ کی فارسی شاعری‘، ڈاکٹر محسن رضا ضیائی نے ’یگانہ کی شاعری میں تصور عشق‘ اور ڈاکٹر عبدالسمیع نے ’یگانہ کے خطوط: ایک جائزہ‘ اور ڈاکٹر فیضان الحق نے ’یگانہ اور منموہن تلخ‘ کے موضوعات پر مقالات پیش کیے۔ سمینار کے اختتام پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

جھار کھنڈ آئی ایس سی سائنس ٹاپر راشدہ ناز کو انجمن ترقی اردو (ہند) جھارکھنڈ کا 100 فیصد اسکالر شپ دینے کا اعلان

انجمن نے انجینئر بننے تک ساتھ نبھانے کا عہد کیا

دھنباد (پریس ریلیز)۔ رواں سال آئی ایس سی امتحان میں ریاستی سطح پر سائنس اسٹریم میں اوّل پوزیشن حاصل کرنے والی طالبہ راشدہ ناز کو انجمن ترقی اردو (ہند) دھنباد نے ان کی رہائش گاہ پر منعقدہ ایک پُر وقار تقریب میں اعزاز سے نوازا۔

تقریب میں راشدہ ناز کو شال، گلدستہ، قلم، مومنٹو اور مٹھائی کے ہمراہ 6,500 روپے نقد بطور انعام پیش کیے گئے۔ انجمن کے ذمہ داران نے ان کے والدین کی بھی گلپوشی کر کے عزت افزائی کی۔

اس موقعے پر انجمن کے سکریٹری ڈاکٹر حسن نظامی، صدر ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد، ڈاکٹر سیف اللہ خالد، سید سرور حسین، آفتاب عالم، سجاد احمد، یونس فردوسی، غلام غوث آسوی، تنویر احمد، راشد مظہر اور ایڈووکیٹ حسنین انصاری موجود تھے۔ تمام مقررین نے راشدہ ناز کی محنت اور لگن کو سراہا اور ان کے روشن مستقبل کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

راشدہ ناز نے اپنے تاثرات میں کہا کہ وہ مستقبل میں انجینئر بننا چاہتی ہیں۔ انجمن نے ان کے اس خواب کی تکمیل تک ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ تقریب کے دوران ڈاکٹر سیف اللہ خالد نے راشدہ ناز کو شاہین اکیڈمی کی دھنباد شاخ میں صد فیصد اسکالرشپ کے ساتھ داخلے کی پیشکش کی۔ ڈاکٹر حسن نظامی نے راشدہ ناز کو انجمن کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کیا اور انہیں انجمن کی رکنیت بھی دی گئی۔ ان کا کہنا تھا کہ راشدہ ناز کی اس تاریخی کامیابی پر پوری قوم فخر محسوس کر رہی ہے۔ یہ کامیابی دیگر طلبہ و طالبات کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

تقریب کے اختتام پر انجمن کے صدر ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد نے دعائیہ کلمات پیش کیے اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

ذاکر حسین کالج میں سالانہ جشن کا انعقاد

نئی دہلی (12 مئی)۔ دہلی یونیورسٹی کے ذاکر حسین کالج (شبینہ) میں سالانہ جشن منعقد کیا گیا جس میں مرکزی وزیرِ مملکت برائے ٹرانسپورٹ و شاہراہ اور کارپوریٹ امور ہرش ملہوترا نے بطورِ مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ تقریب میں طلبہ، اساتذہ اور مختلف شعبوں سے وابستہ شخصیات کی بڑی تعداد موجود تھی۔ انھوں نے کہا کہ اس کالج سے ان کا تعلق زمانۂ طالبِ علمی سے رہا ہے۔ انھوں نے وزیرِ اعظم نریندر مودی کی قیادت میں نافذ نئی تعلیمی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ تعلیمی نظام طلبہ کو صرف نصابی تعلیم تک محدود نہیں رکھتا بلکہ انھیں سماجی اور عملی زندگی کے لیے بھی تیار کرتا ہے۔ انھوں نے گزشتہ برسوں میں حکومت کی جانب سے کیے گئے مختلف اقدام کا حوالہ دیتے ہوئے کشمیر سے دفعہ 370 کی منسوخی اور خواتین کو قانون ساز اداروں میں 33 فیصد ریزرویشن دیے جانے کو اہم قدم قرار دیا۔ انھوں نے نوجوانوں سے ’ون نیشن، ون الیکشن‘ کے تصور پر سنجیدگی سے غور کرنے کا اپیل کرتے ہوئے کہا کہ اس سے انتخابی اخراجات میں کمی آئے گی اور ترقیاتی کام مسلسل جاری رہ سکیں گے۔ تقریب کے دوران کالج کے نئے ’لوگو‘ کی بھی رونمائی کی گئی۔ اس موقعے پر کالج کے پرنسپل پروفیسر بھرت سنگھ نے ادارے کی تاریخی وراثت اور تعلیمی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے طلبہ سے کہا کہ وہ صرف کالج کی پیداوار نہیں بلکہ اس کے مقصد اور روایت کا حصہ ہیں۔ تقریب میں امیش کمار دھیانی، ڈاکٹر اجیت کمار، بلرام پانی، جے پی شرما اور معروف ماہرِ معاشیات عاصم رضا سمیت دیگر معزز شخصیات نے بھی خطاب کیا اور نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے طلبہ کو انعامات سے نوازا۔ تقریب کی نظامت پرانجل سنگھ اور شبھرا پنت کوٹھاری نے کی۔

کیفی اعظمی کے 24ویں یومِ وفات پر
محکمۂ ڈاک کی جانب سے پوسٹل کوَر کا اجرا

ممبئی (11 مئی) عالمی شہرت یافتہ شاعر، ادیب اور نغمہ نگار کیفی اعظمی کے 24ویں یومِ وفات پر 10 مئی 2026 کو مہالکشمی کے جی فائیو اے فاؤنڈیشن میں محکمۂ ڈاک کی جانب سے ان کی یاد میں مہاراشٹر اور گوا کے چیف پوسٹ ماسٹر جنرل امیتابھ سنگھ کے ہاتھوں پوسٹل کوَر (لفافہ) کا اجرا کیا گیا، ساتھ ہی کیفی صاحب کی شاعری پر مبنی فلم 'راگ شاعری' دکھائی گئی۔ اس فلم میں کیفی صاحب کی 13 تاریخی نظمیں پیش کی گئیں جنھیں معروف موسیقار شنکر مہادیون نے اپنی مترنم آواز میں گایا ہے۔ ان نظموں کی موسیقی بھی انھوں نے ترتیب دی ہے۔

اس موقعے پر کیفی اعظمی کی شاعری سے متعلق ان کے داماد اور معروف نغمہ نگار و مصنف جاوید اختر نے کہا کہ کیفی صاحب رومانی اور انقلابی شاعر تھے۔ انھوں نے دونوں طرح کی شاعری کی اور دونوں پر ان کی برابر دسترس تھی۔ وہ عوامی شخصیت تھے۔ ان کے گھر کا دروازہ سب کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ کوئی بھی کسی بھی وقت ملاقات کے لیے آسکتا تھا۔ جاوید اختر نے اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ایک مرتبہ ایک فلم اداکارہ اُن کے گھر آئیں، گھر میں کوئی نہیں تھا مگر دروازہ کھلا تھا، وہ گھر سے ایک کیسٹ پلیئر اٹھا کر لے گئیں تاکہ بتا سکیں کہ گھر کے لوگ کس طرح کے غیر محفوظ ماحول میں رہ رہے ہیں۔ (انقلاب۔دہلی)

جشنِ آنا دھلوی کا انعقاد

نئی دہلی (28 اپریل)۔ پونے کی مشہور ادبی تنظیم اے.سی.ایف.سی. (اسلم چشتی فرینڈ سرکل پونے) کے زیرِ اہتمام غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں ممتاز شاعرہ ڈاکٹر انا دہلوی کے ایک باوقار اور یادگار جشن کا انعقاد کیا گیا اور ان کی آٹھویں کتاب 'تلاش' کی رسمِ اجرا مہمانِ خصوصی ساجد احمد کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ ساتھ ہی کُل ہند مشاعرے کا اہتمام بھی کیا گیا جس میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے ممتاز شعرا نے شرکت کی۔ یہ ادبی تقریب اپنے منظّم انداز، مہذب ماحول اور معیاری پیشکش کے باعث ابتدا ہی سے سامعین کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ اس ادبی محفل کی صدارت معزز اور صاحبِ علم سہیل صدیقی (علیگ) نے فرمائی جس میں انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں ادب کی اہمیت، تخلیقی اظہار کی ضرورت اور نئی نسل کے ادبی رجحانات پر روشنی ڈالی۔ دیگر مہمانانِ ذی وقار کشش وارثی، جاوید رحمانی، تنویر احمد خاں کی موجودگی نے اس مشاعرے کو ایک خاص شان عطا کی۔ تقریب کا باقاعدہ آغاز سہیل صدیقی علیگ نے شمع روشن کرکے کیا۔ پہلے سیشن کی نظامت مشہور صحافی اور ناظمِ شاعرہ ڈاکٹر وسیم راشد نے انجام دی جس میں اے سی ایف سی (پونے) ادبی تنظیم کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی، اسی میں کتاب کی رسمِ اجرا بھی شامل تھی اور ڈاکٹر انا دہلوی کی ادبی کاوشوں کو خوب سراہا گیا۔ اس موقعے پر اے سی ایف سی کی جانب سے اسلم چشتی نے سپاس نامہ پڑھ کر سنایا اور انھوں نے تمام معزز مہمانان، شرکا اور معاونین کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا۔ بعدازاں مشاعرے کا آغاز ہوا جس کی نظامت ممتاز ناظمِ مشاعرہ معین شاداب نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دی۔ شعرا میں اسلم چشتی، ڈاکٹر انا دہلوی، جاوید مشیری، معین شاداب، کشش وارثی، پروفیسر رحمان مصوّر، ڈاکٹر وسیم راشد، ضیاء باغپتی، امیر امروہوی، سرتاج امروہوی، وارث وارثی، شرف نانپاروی، انس فیضی، دانش ایوبی، جاوید نیازی، جاوید عباسی، میناکشی ججی دِشا، صبا عزیز، چیتنا کپور شفق اور شارقہ ملک شامل تھے۔ شعرائے کرام نے اپنے منتخب اشعار کے ذریعے سامعین کو خوب محظوظ کیا اور دادِ تحسین کی صدائیں محفل میں گونجتی رہیں۔ سامعین میں موجود معزز مہمانان کے ساتھ ساتھ کئی مشہور شعرا اور صحافی بھی بطورِ سامع شریک تھے۔ (سیاسی تقدیر۔دہلی)

رفتید ولے نہ از دلِ ما

ڈاکٹر بشیر بدر

بھوپال۔ اردو کے نامور شاعر اور پدم شری ایوارڈ یافتہ ڈاکٹر بشیر بدر کا طویل علالت کے بعد 28 مئی 2026 کو بھوپال میں 91 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ محبت، تنہائی، ہجرت اور انسانی جذبات کو سادہ مگر گہرے انداز میں بیان کرنے والے بشیر بدر کو جدید اردو غزل کی سب سے مقبول آوازوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ ان کے انتقال پر ہندستان سمیت دنیا بھر کے ادبی، ثقافتی اور شعری حلقوں میں گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا ہے، جب کہ سوشل میڈیا پر اُن کے مداحوں نے ان کے لازوال اشعار کے ذریعے خراجِ عقیدت پیش کیا۔

اردو ادب کی دنیا ایک عظیم سانحے سے اُس وقت دوچار ہوئی جب ممتاز شاعر ڈاکٹر بشیر بدر کے اہلِ خانہ نے ان کی وفات کی تصدیق کی، جس کے بعد پورے ہندستان اور بیرونِ ملک ادبی حلقوں میں سوگ کی فضا چھا گئی۔ ان کی شاعری نے نہ صرف اردو ادب کے سنجیدہ قارئین بلکہ عام لوگوں کے دلوں میں بھی غیر معمولی جگہ بنائی۔

15 فروری 1935 کو اترپردیش کے فیض آباد (ایودھیا) میں پیدا ہونے والے ڈاکٹر بشیر بدر نے ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے بی اے، ایم اے اور پی ایچ.ڈی مکمل کی، بعدازاں انھوں نے تدریسی زندگی کا آغاز کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بعد تقریباً سترہ برس تک میرٹھ کالج میں اردو شعبے کے سربراہ کے طور پر خدمات انجام دیں۔ بشیر بدر نے صرف سات برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کردیا تھا۔ اردو، فارسی، ہندی اور انگریزی زبانوں پر اُن کی گرفت تھی۔ ان کی شاعری کی سب سے نمایاں خوبی اس کی سادگی اور جذباتی گہرائی تھی، جس نے انھیں عوامی سطح پر بے حد مقبول بنا دیا۔

1999 میں انھیں ادب کے شعبے میں نمایاں خدمات پر ہندستان کے چوتھے بڑے شہری اعزاز 'پدم شری' سے نوازا گیا تھا۔ اُسی سال اُنھیں اُن کے مجموعۂ کلام 'آس' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی دیا گیا۔ اس کے علاوہ انھیں اترپردیش اردو اکادمی اور بہار اردو اکادمی سمیت کئی قومی و بین الاقوامی اعزازات سے نوازا گیا۔ ان کی شاعری دیوناگری اور گجراتی رسمِ خط میں بھی شائع ہوئی، جب کہ ان کے کلام کے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں تراجم بھی ہوئے۔ ان کی شاعری ہندستانی سیاست اور عوامی زندگی میں بھی بارہا سنائی دی۔

1987 کے میرٹھ فسادات نے ان کی زندگی بدل کر رکھ دی۔ ان فسادات میں ان کا گھر اور قیمتی ادبی سرمایہ جل کر خاک ہوگیا تھا۔ اس سانحے کے بعد وہ شدید ذہنی صدمے سے گزرے اور پھر مستقل طور پر بھوپال منتقل ہوگئے، جہاں انھوں نے اپنی زندگی اور ادبی سفر کو نئے سرے سے شروع کیا۔ بعد کے برسوں میں وہ ڈیمنشیا سمیت کئی عارضوں میں مبتلا رہے۔ 2018 میں ایک انٹرویو کے دوران وہ اپنے بعض مشہور اشعار مکمل طور پر یاد نہیں پڑھ سکے تھے جس پر ان کے مداح انتہائی غم زدہ ہوئے تھے۔ ان کے قریبی حلقوں کے مطابق آخری برسوں میں وہ زیادہ تر عوامی زندگی سے دور رہے۔ ڈاکٹر بشیر بدر کے انتقال پر ملک بھر کے ادیبوں، شاعروں، سیاسی شخصیات، فلمی حقوں اور مداحوں نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ بشیر بدر کے انتقال سے اردو غزل کا ایک سنہری باب ختم ہوگیا، تاہم ان کی شاعری ہمیشہ زندہ رہے گی اور آنے والی نسلوں کو متاثر کرتی رہے گی۔ ان کے بیٹے نصرت بدر بھی معروف نغمہ نگار ہیں۔ ڈاکٹر بشیر بدر کی وفات اردو ادب کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان قرار دی جارہی ہے، لیکن ان کے اشعار ہمیشہ اردو زبان کی روح میں زندہ رہیں گے۔

اُردو زبان و ادب کا پہلا محقق و مدرس

جان بارتھ وِک گل کرسٹ

تالیف و ترجمہ

صدیق الرحمٰن قدوائی

قیمت: 250 روپے

ڈاکٹر محمد فیروز دھلوی

نئی دہلی۔ پُرانی دہلی کی علمی، ادبی اور تہذیبی روایت کے امین، ذاکر حسین دہلی کالج کے سابق استاد ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی کا 84 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ انھوں نے اپنی رہائش گاہ کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج نئی دہلی میں آخری سانس لی۔ وہ گذشتہ کئی دنوں سے علیل اور صاحبِ فراش تھے۔ ان کے انتقال سے اُردو دنیا بالخصوص پرانی دہلی کے ادبی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی نے ذاکر حسین دہلی کالج میں قریب دو دہائی تک اردو کے لکچرار کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ وہ نہ صرف ایک مخلص اور باوقار استاد تھے بلکہ تہذیبِ دہلی کے سچے نمائندہ اور شائستگی و وضع داری کی جیتی جاگتی مثال تھے۔ ان کی گفتگو، نشست و برخاست اور طرزِ فکر میں قدیم دہلی کی علمی روایت اور تہذیبی خوشبو نمایاں محسوس ہوتی تھی۔ مرحوم کی علمی و ادبی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انھوں نے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کے فروغ میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ انجمن تعمیرِ اُردو کی ادبی و فکری پالیسیوں کی تشکیل میں ان کی رائے کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ وہ دہلی کی تاریخ اور زبان و تہذیب پر اتھارٹی سمجھے جاتے تھے۔ یوں تو انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں لیکن انھیں 'تلمیذِ غالب میر مہدی مجروح: حیات اور تصانیف' اور 'لندن کی ایک رات کا خصوصی مطالعہ و تجزیہ' پر فخر تھا۔ انھیں ادبی خدمات کے لیے متعدد ایوارڈ حاصل ہوئے تھے جن میں اردو اکادمی، دہلی کا بڑا اعزاز پنڈت دتاتریہ کیفی ایوارڈ قابلِ ذکر ہے۔

ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کہا کہ ڈاکٹر فیروز دہلوی پرانی دہلی کی تہذیبی روایت کے آخری نمائندوں میں تھے۔ وہ علم و ادب کے شیدائی، نفیس انسان اور اُردو زبان کے سچے خادم تھے۔ انھوں نے طویل عرصے تک تدریسی خدمات انجام دے کر بے شمار طلبہ کی علمی رہنمائی کی۔ اردو کے فروغ اور ادبی سرگرمیوں میں ان کا کردار ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ متعدد ادیبوں اور صحافیوں نے بھی ان کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے جن میں بزرگ صحافی مودود صدیقی، پروفیسر مظہر احمد، سینئر صحافی سہیل انجم شامل ہیں۔ پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ وہ لاولد تھے۔ ان کی نمازِ جنازہ 16 مئی 2026 کی صبح دس بجے ادا کی گئی اور دہلی گیٹ قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

اُردو شاعری میں عشقِ حقیقی کا تصوّر

(بقیہ صفحہ 2 سے آگے)

طبل وعلم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہوکے کرے گا زمانہ کیا

———

بے اعتبار نقش و نگار زمانہ ہے
اک رنگ پر ہوانہیں رہتی ہے باغ کی

شاعرِمشرق علامہ اقبال عشق کوخداشناسی وخودشناسی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ان کے نزدیک عشق معرفت خدا کی ایک وجدانی تعبیر ہے۔اقبال کے یہاں عشق وہ قوت متحرکہ ہے جس کے وسیلے سے زندگی اورفن میں تب وتاب حاصل کی جاسکتی ہے۔انسان عشق کے ذریعے کائنات کومسخر کرسکتا ہےاور زمان ومکان پر غالب آسکتا ہے۔عشق کاروان وجودکو ہر لحظہ نئی شان سے آگے بڑھانے پر اکساتا ہے۔اقبالؔ کا عقیدہ ہے کہ زندگی اورفن دونوں میں عشق ہی کا جلوہ ہے:

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر وبم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دمبدم

اقبالؔ کے نزدیک عشق وہ حرارت ہے جوساری حیات کوزندگی بخشتی ہے:

عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات
عشق ہے نور حیات عشق ہے نار حیات

اقبالؔ کے یہاں عشق حرکت وعمل کی وہ قوت ہے جوآرزوؤں اورتمناؤں میں آنکھ کھول کر کاروان وجودکو ہرلحظہ نئی شان سے آگے بڑھاتی ہے۔اسی کے دم سے زندگی کی رنگینی ہے۔ان کے یہاں افلاطون کی طرح سکونی زندگی کا خواب نہیں بلکہ ان کے عشق میں سوزش بھی ہے اور سرخوشی وسرمستی بھی۔آہ ونالہ،سوز وساز،تب وتاب اور درد وداغ سب کچھ پنہاں ہے۔سکون وجمود کو وہ موت کے مترادف گردانتے ہیں۔کہتے ہیں:

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کائنات وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شان وجود

اقبالؔ کا عقیدہ ہے کہ انسانیت کی تاریخ کے کارناموں کے جو ابھرتے ہوئے نقوش دکھائی دیتے ہیں وہ عشق ہی کے مرہون منت ہیں۔اس طرح کی اکمل ترین مثال ہمیں صدق خلیل اوراسوہ حسین میں ملتی ہیں اور کارزارحیات میں بدروحنین کاواقعہ بھی عشق ہی کا کرشمہ ہے:

وہ عشق جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک
اس میں مزہ نہیں تپش و انتظار کا

آیئے! اب اقبال کے تصورعشق کے روحانی نظام کے بعض پہلوؤں کا جائزہ ان کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کے حوالے سے لیا جائے۔اس نظم میں اقبال نے ایک نئی جہت سے عشق کی اہمیت ومعنویت کواجاگر کیا ہے۔کائنات کی تمام چیزوں کوفنا نصیب ہے لیکن عشق کوفنائیت نصیب نہیں۔لہذا عشق کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہےاور سب سے بڑی طاقت بھی۔عشق کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے مثلاً خدا کا کلام عشق غیر فانی ہے۔جیسے دم جبریل عشق کائنات کی مقدس ترین چیز ہے جیسے دل مصطفیٰ۔عشق ہی کائنات میں مقتدر اور حکمراں ہے جیسے فقیہ حرم اورامیر جنود۔دیکھیے بال جبریل کی نظم 'مسجد قرطبہ' کا یہ بند:

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کِیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات،موت ہے اس پر حرام

تُند و سبک سَیر ہے گرچہ زمانے کی رَو
عشق خود اک سَیل ہے،سَیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رُسول، عشق خدا کا کلام

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گِل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاسُ الکِرام

عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جُنود
عشق ہے ابن السّبیل،اس کے ہزاروں مقام

عشق کے مِضراب سے نغمہ تارِ حیات
عشق سے نُورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

مذکورہ اشعاراس بات کے ضامن ہیں کہ اقبال کے نزدیک دین کا جوہر عشق ہےاورایمان کی کسوٹی بھی عشق ہے۔اقبال نے اسی تصورِعشق سے اپنی بصیرت افروز حکیمانہ شاعری کی رفیع الشان عمارت تعمیر کی ہے۔

اردو شاعری میں عشق حقیقی کے اہم پہلوؤں کی نمائندگی کرنے والوں میں ایک نمایاں نام اصغر گونڈوی کا بھی ہے۔ان کے یہاں تصوف کے جس پہلوکواجاگر کیا گیا ہے،اس کا ماحصل یہ ہے کہ خدا نور یا حسن ہے اس لیے اس کا ادراک مادی حسن کی دنیا میں ہی کیا جا سکتا ہے۔لہذا انسانی روح روح اعظم کا عکس ہے۔مبداءِ عالم حسن ہے اور حسن اظہار چاہتا ہے۔اس لیے ہمارے صوفی شعرا ایسی کائنات کے رنگا رنگ حسن کی توجیہ حسن ازل کی نمائش کے جذب کی روشنی میں کرتے رہے۔اصغر گونڈوی کے کلام سے چنداشعار ملاحظہ ہوں:

میری نگاہوں نے جھک کر کردیے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے حسن یار ہوا

———

ہر ذرہ آئینہ ہے کسی کے جمال کا
یونہی نہ جانیے مری مشتِ غبار کو

———

نور آنکھوں میں اسی کا جلوہ خود نور محیط
دید کیا ہے کچھ تلاطم میں ہجوم نور ہے

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے شعرانے اپنی شاعری میں عشق حقیقی کا جوتصور پیش کیا ہےاس کے توسط سے ہم تصوف کے کئی اہم پہلوؤں کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔تصوف ایک ذہنی عقیدہ اور مسلک بھی ہےاور ایک فلسفیانہ نقطہ نظر بھی۔تصوف دراصل ایک نظام سے زیادہ ایک تجرباتی وسیلہ ہے جس نے اردو کی عشقیہ شاعری کو ایک معنوی وسعت عطا کی ہے،جس کے نتیجے میں ہمارے شعرانے اپنے معروف اور روحانی خیالات کوزبردست قوت بیانی سے پُرکشش انداز میں بیان کردیا ہے۔

سابق ڈین فیکلٹی آف ہیومنٹیز وصدر شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی، رانچی
موبائل: 8210470292

ظفر کلیم اور 'ایک نوائے حرفِ خموش'

(بقیہ صفحہ 3 سے آگے)

یہ سلگتی ہے رئیسوں کے گھروں سے پہلے
یہ دہکتی ہے پراگندہ سروں سے پہلے
ہرطرف لوٹ کے بازار سجے ہوتے ہیں
گھات میں اپنی سیاہ کار لگے ہوتے ہیں
ان لعینوں سے بھلائی کی کوئی آس نہیں
ان کو مریم کے تقدس کا بھی احساس نہیں

نظم 'اردو' میں اس ملک میں قومی اردو کوقومی یکجہتی کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ظفر کلیم کی نظم 'پیاس' شدتِ پیاس اورکربِ ذات کی ترجمانی کرتی ہے۔نظم 'بوڑھا برگد' میں بزرگوں کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ان کی دیگر نظموں میں شہر کی ہنگامہ آرائیاں اور سیاست،فسادات اور تعصب کی تباہ کاریوں پرصدائے احتجاج بلند کی گئی ہے۔ظفر کلیم کی نظم نگاری کے متعلق ڈاکٹر شرف الدین ساحل لکھتے ہیں:

''ایک بیانیہ نظم 'بمبئی' میں اس شہر کی ہنگامہ آرائیوں کا تفصیلی ذکر ہے۔نظم 'فیصلہ' جوانتیس اشعار پر مشتمل ہے سب سے طویل ہے، گودھرا کانڈ کے تناظر میں کہی گئی ہے،جس نے ریاست گجرات میں انسانیت کوجلا کر راکھ کردیا تھا۔اس بیانیہ نظم میں اس فساد کی جڑ کوتلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے''۔[۴]

ظفر کلیم کی شاعری میں زندگی کی بے ثباتی،انسانی رشتوں کی شکست وریخت اوراخلاقی قدروں کے زوال کے مناظر اوران پر افسوس کا اظہار بھی ملتا ہے:

ہنسے کوئی مگر رونے میں کتنی دیر لگتی ہے
اچانک حادثہ ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے
یوں دوستوں میں ڈھونڈ رہے ہیں خلوص ہم
صحرا میں جیسے کھوج کسی سائبان کی
کون جانے تیری آنکھوں سے چھلکتا آنسو
کتنے سوئے ہوئے طوفان جگا کر آیا

ظفر کلیم نے حمد ونعت میں اپنے احساسات اور جذبات کو بہ حسن وخوبی بیان کیا ہے۔ان کے درجِ ذیل اشعار ان کی شخصیت کے مذہبی پہلو کو نمایاں کرتے ہیں:

اسی کے نام سے اپنا سخن منسوب کرتا ہوں
زبان گونگوں نے پائی ہے جس کے اعجازِ تکلم سے
چھین لیں جب بلندیاں اس نے
یاد آیا کہ ہے خدا سب کچھ
ہر اک عروج کے پیچھے زوال ہے لیکن
مجھے عروج دے ایسا جسے زوال نہ ہو

ظفر کلیم کی رحلت اردو ادب کا ایک بڑا خسارہ ہے،لیکن ان کی شعری خدمات اردو ادب میں ان کا مقام طے کرنے میں معاون ثابت ہوں گی۔

حواشی :

۱۔ سرنامۂ ماضی وحال،ظفر کلیم،نوائے حرفِ خموش، ناگپور 2007،ص 26۔
۲۔ ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن،شخصیاتِ ودربھ۔ناگپور،2015،ص150
۳۔ نوائے حرفِ خموش، ناگپور، 2007،فلیپ پر تحریر
۴۔ ڈاکٹر شرف الدین ساحل۔ناگپور میں اردو شاعری،2016،ناگپور ص190۔

30،گلستان کالونی،نزد پانڈے،امرائی لانس،جعفر نگر، ناگپور-440013
E-mail: zarnigar2005@yahoo.com
Mobile: 9579591149

ادبی رسالوں کی دُنیا

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

نکال رہے ہیں۔ وہ 'رہنمائے تعلیم آف لاہور' سے 1967 سے وابستہ رہے ہیں۔ اس رسالے کی ایک شاندار روایت رہی ہے جس کا اعتراف اردو کے انتہائی جید قلم کاروں، شاعروں اور ادیبوں نے کیا ہے، جن میں علامہ اقبال، صوفی غلام مصطفی تبسم، ناخدائے سخن نوح ناروی، جوش ملسیانی، ملا رموزی، عبدالرؤف عشرت، خواجہ حسن نظامی اور بیشتر وزرا، سیاست داں اور انگریزی روزنامہ 'مسلم آؤٹ لک' (لاہور)، زمانہ (کانپور)، زمیندار (لاہور)، معارف (اعظم گڑھ) اور دیگر بے شمار ادبا وشعرا اور علما وفضلا شامل ہیں۔ اس پرچے نے چند بہت اچھے اور معیاری خصوصی شمارے بھی شائع کیے جو ہمارا ادبی وقومی ورثہ ہیں۔

مرکزی حکومت کے ادارے پبلی کیشن ڈویژن دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'آجکل' کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ پرچہ 1942 سے نکل رہا ہے اور اس سے جوش ملیح آبادی، معین احسن جذبی، جگن ناتھ آزاد، محبوب الرحمٰن فاروقی، عابد کرہانی، حسن ضیا اور دوسرے بہت سے قدآور ادیب وشاعر وابستہ رہے ہیں۔ اس نے بھی بہت سے خصوصی شمارے شائع کیے ہیں جو اردو ادب کی تاریخ میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں، جن میں اقبال، میر، غالب، نظیر اکبرآبادی، مولانا آزاد، منٹو، جاں نثار اختر، غلام ربانی تاباں وغیرہ پر خصوصی شماروں کے علاوہ 1857 کی پہلی جنگِ آزادی کی ڈیڑھ سو سالہ تقریب کی مناسبت سے خصوصی شمارہ اور ہندستانی فلم انڈسٹری کے سو سال پورے ہونے پر خصوصی شمارہ قابلِ ذکر ہیں۔

حکومت اتر پردیش کے محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ لکھنؤ سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'نیا دور' کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے۔ یہ پرچہ 1955 سے نکل رہا ہے، اگرچہ اس کی اشاعت میں تسلسل نہیں ہے لیکن اس نے بھی بہت سے خصوصی شمارے شائع کیے ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں، جن میں نصف صدی نمبر، اودھ نمبر، منشی نولکشور نمبر، بہادر شاہ ظفر نمبر، فراق گورکھپوری، میر تقی میر، مسعود حسن، عبدالماجد دریابادی، مہاتما گاندھی، جمہوریت، اندرا گاندھی، فیض احمد فیض، قرۃ العین حیدر، مجاز وغیرہ پر خصوصی شماروں کے علاوہ اردو صحافت نمبر بھی شائع کیا ہے۔ مذکورہ رسالوں نے اردو معاشرے کو ایسا معیاری ادب پیش کیا ہے اور آج بھی پیش کررہے ہیں جو اس کے اعلا ذوق کو جلا بخشتے ہیں اور اسے تہذیبی و ثقافتی طور پر مالا مال کرتے ہیں۔

لیکن آج کے بدلتے ہوئے ماحول میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ قارئین کو کس قسم کی تخلیقات پیش کی جائیں اور وہ کیسا ادب پسند کرتے ہیں۔ دراصل یہ سوال اُن لوگوں کے سامنے زیادہ شدت سے کھڑا ہو رہا ہے جو عصری تقاضوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور ان کا وژن محدود ہے، جو مدیر حضرات قارئین کی نبض پہچانتے ہیں وہ ان کی پسند کا خیال اور لحاظ بھی رکھتے ہیں، لیکن ایسے بھی مدیر حضرات ہیں جو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اپنی پسند کی چیزیں پیش کرتے ہیں اور قارئین ان کو پسند بھی کرتے ہیں۔ ماضی میں 'جاسوسی دنیا' اور 'شمع' کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جنھیں خریدنے کے لیے قارئین انتظار کرتے تھے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مدیر حضرات میں اس کی صلاحیت ہو کہ وہ اپنی پسند کی چیزیں قاری کو پڑھوا سکیں۔ ظاہر ہے یہ کام وہی کرسکتا ہے جس کی نہ صرف قومی ادب پر بلکہ عالمی ادب پر بھی گہری نظر ہو اور جو بدلتے ہوئے رجحانات ومیلانات کو سامنے رکھ کر نئی نئی چیزوں کو سلیقے کے ساتھ پیش کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہو۔

رسالوں میں مواد کے ساتھ ساتھ ترسیل اور مالی منافع کا بھی مسئلہ ہوتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آج رسالوں اور جریدوں کے مالکوں اور مدیروں کے سامنے ترسیل کا مسئلہ نہیں ہے۔ آج پرچے بھیجنے کی بہت سی سہولتیں پیدا ہوگئی ہیں جن سے لوگ استفادہ کررہے ہیں۔ البتہ مارکیٹنگ کا مسئلہ ہے، جن رسالوں کا انتظامیہ اس فن سے واقف ہے ان کی تعدادِ اشاعت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے شائع ہونے والا بچوں کا رسالہ 'بچوں کی دنیا' ہے۔ اس کے آغاز پر اس کی تعدادِ اشاعت بہت زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھی، لیکن چند مہینوں کے اندر ہی اس کے سرکولیشن میں بے پناہ اضافہ ہوگیا تھا۔ اسی طرح ماہنامہ 'اردو دنیا' ہے جو اپنی خوب صورت چھپائی، کاغذ اور معیار کے لحاظ سے دوسرے رسائل سے کہیں آگے ہے۔ ان دونوں رسالوں کے سامنے نہ تو ترسیل کا مسئلہ ہے اور نہ ہی مارکیٹنگ کا۔ مارکیٹنگ کے مسائل سے دوسرے سرکاری پرچے زیادہ دوچار ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرکاری محکموں میں موجود بعض افراد اس سے کوئی دل چسپی نہیں رکھتے۔ اگر وہ ان پرچوں کو اپنا پرچہ تصور کرکے ان کو بیچنے کے نئے نئے طریقے ڈھونڈیں تو ان کے لیے بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا، جیسے کہ 'آجکل' ہے۔ وہ ایک بہت اچھا پرچہ ہے اور اس سے بڑے بڑے ادیب اور انتہائی سرکردہ شخصیات وابستہ رہی ہیں۔ اس کے قارئین کا حلقہ بھی اہلِ ذوق افراد پر مشتمل ہے۔ اس میں فروخت ہونے کے امکانات بھی ہیں اور اس کا ذوق بھی ادبی ہے، لیکن اس کا سرکولیشن حوصلہ شکن ہے۔

پرائیویٹ رسالوں نے اپنی بقا کے لیے بدرجۂ مجبوری ایک ایسا راستہ اختیار کرلیا ہے جو زیادہ لوگوں کو پسند نہیں۔ وہ راستہ ہے گوشے نکالنے کا۔ اس کا آغاز 'شاعر' جیسے تاریخی پرچے نے کیا تھا جس کے بانی حضرت سیماب اکبرآبادی تھے۔ کسی بھی رسالے کو زندہ رکھنے کے لیے صرف تخلیق کار اور قارئین ہی کافی نہیں بلکہ خطیر سرمایے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ سرمایے کے بغیر کوئی رسالہ نہ تو چھپ سکتا ہے اور نہ ہی قارئین کے پاس بھیجا جاسکتا ہے، تو پھر اس صورت میں جب کہ پرچے منافع بخش نہ رہ جائیں اور ان کے سروں پر امرا اور اہلِ خیر حضرات کا دستِ شفقت نہ ہو تو پھر ان کے زندہ رہنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے، اسی لیے اب دوسرے نجی پرچوں نے بھی 'شاعر' کی روش اختیار کرلی ہے اور اب وہ بھی گوشے نکالنے لگے ہیں۔ شروع میں تو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دوسرے اور تیسرے درجے کے شعرا و ادبا پر گوشے کیوں نکالے جارہے ہیں، لیکن اب کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لوگ گوشے دیکھ کر خود بخود سمجھ جاتے ہیں کہ فلاں شاعر یا ادیب پر اتنے صفحات کیوں صرف کیے گئے۔ ہاں کچھ پرچے ایسے بھی ہیں جو گوشے تو نکالتے ہیں لیکن اس بارے میں معیار کا خیال بھی رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایسی برآوردہ شخصیات پر گوشے شائع کرتے ہیں جن کے بارے میں یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ انھوں نے اس کے عوض پرچے کے اہتمام اور طباعت کی ذمے داری لی ہوگی کیوں کہ ان کو اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ان کا قد ادب وشاعری میں اتنا بلند ہے کہ لوگ ازخود ان پر مضامین شائع کرکے اپنے پرچوں کو وقیع اور معیاری بناتے ہیں، لیکن بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ گوشوں کی اشاعت سے ان پرچوں نے اپنی بقا کا کسی نہ کسی طرح انتظام کرلیا ہے جن کے اڈیٹر مالی اعتبار سے مستحکم نہیں ہیں۔

بچوں کے رسالے 'بچوں کی دنیا' کا ذکر آچکا ہے، بچوں کے بعض دوسرے رسائل بھی اپنی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔ گوجرانوالا پاکستان کے منشی محبوب عالم نے 1902 میں 'بچوں کا اخبار' نام سے بچوں کا رسالہ شروع کیا تھا جسے ادب اطفال میں اولین رسالے کا شرف حاصل ہے۔ وہ دس سال تک نکلا۔ اس کے بعد مولوی ممتاز علی نے 'پھول' نکالا جو 48 سال تک نکلنے کے بعد 1958 میں بند ہوا۔ مکتبہ جامعہ کا رسالہ 'پیامِ تعلیم' بھی اپنی ایک تاریخ رکھتا ہے۔ وہ 1926 میں شروع ہوا لیکن اب شاید تسلسل سے نہیں نکل رہا ہے۔ شمع گروپ کا رسالہ 'کھلونا' بھی بہت مقبول پرچہ تھا۔ اس کے علاوہ 'نور' (رام پور)، 'غنچہ' (بجنور)، 'بچوں کا اچھا ساتھی' (سرکڑہ، بجنور)، 'کلیاں' (لکھنؤ)، 'ٹافی'، 'اسکول ٹائم' اور 'گل بوٹے' (ممبئی) جیسے رسالوں کی بھی اپنی تاریخ ہے۔ اس کے علاوہ بنگلور سے 'غبارہ' اور حیدرآباد سے 'فنکار' نکل رہے ہیں۔ یہ بھی بچوں کے رسالے ہیں۔

البتہ آج کل طنز ومزاح کے پرچے کم نکلتے ہیں۔ پہلے کئی رسالے نکلتے رہے ہیں لیکن اس وقت ہندستان اور پاکستان سے طنز ومزاح کا واحد رسالہ 'شگوفہ' ہے جو حیدرآباد سے نکلتا ہے۔ اس میدان میں اس نے جو تاریخ مرتب کی ہے وہ کسی بھی پرچے کے لیے باعثِ فخر ہوسکتی ہے۔ یوں تو جب بھی طنز ومزاح کی بات آتی ہے تو لکھنؤ کے 'اودھ پنچ' کا نام لیے بغیر بات مکمل نہیں ہوتی۔ اس رسالے نے طنز ومزاح کی صنف کے فروغ میں جو نمایاں رول ادا کیا ہے اسے اردو دنیا کبھی فراموش نہیں کرسکتی، لیکن تعدادِ اشاعت اور سلسلۂ اشاعت میں 'شگوفہ' نے بھی ایک تاریخ رقم کی ہے۔ یہ رسالہ 10 نومبر 1968 سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس کا ایک بھی شمارہ نہ تو ناغہ ہوا ہے اور نہ ہی ایک سے زائد شماروں پر مشتمل اس کا کوئی شمارہ نکلا ہے۔ اس کا سہرا بلاشبہ اس کے اڈیٹر مصطفی کمال کے سر جاتا ہے۔ یہ رسالہ برابر نکل رہا ہے۔ کسی بھی اڈیٹر کے لیے اتنی لمبی مدت تک کسی رسالے کی ادارت کی ذمے داری سنبھالنا بھی فخر کی بات ہے۔ اس رسالے کی اشاعتِ مسلسل اور اس کی مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ اس کو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کا فن آتا ہے۔ اس میں طنز ومزاح کے اعلا نمونے شائع ہوتے ہیں، چھچھورے اور مزاح کے نام پر بھونڈے پن والے مضامین نہیں۔ 'شگوفہ' کے علاوہ بنگلور سے طنز ومزاح کا ایک رسالہ 'ظرافت' بھی نکلتا ہے لیکن وہ ماہنامہ نہیں بلکہ سہ ماہی ہے۔

ادبی رسالوں کے مساوی ملک بھر سے مذہبی رسالے بھی بڑی تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔ اسی طرح طبی رسائل بھی خاطر خواہ تعداد میں نکلتے ہیں۔ اس پورے ملک سے خاصی تعداد میں ادبی، سیاسی، علمی اور مذہبی رسالے نکلتے ہیں، لیکن اردو آبادی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ تعداد بہت کم ہے۔ ابھی مزید رسالوں کی گنجائش ہے، یا جو رسالے شائع ہو رہے ہیں ان کا سرکولیشن بڑھ سکتا ہے، ان کے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہوسکتا ہے، لیکن اس کے لیے اردو والوں کو سامنے آنے کی ضرورت ہے۔ انھیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ انھیں اردو سے محبت ہے اور وہ اردو کو چاہتے ہیں۔ ابھی تک ہم ایسا کوئی بھی ثبوت دینے سے قاصر ہیں۔

370/6A، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025
E-mail: sanjumdelhi@gmail.com
Mob. 9818195929

اردو ہندی ڈکشنری
انجمن ترقی اردو (ہند)
قیمت: 300 روپے

اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری
مولوی عبدالحق
قیمت: 500 روپے

ادبی رسالوں کی دُنیا

سہیل انجم

برّصغیر کی لائبریریاں ادبی رسائل کی ایک بھرپور تاریخ کی محافظ ہیں۔ برّصغیر میں صحافت کے آغاز کے ساتھ ہی اخباروں میں ادبی نگارشات بھی شائع ہونے لگی تھیں۔ رفتہ رفتہ ادبی جریدوں نے جنم لیا اور انہی جریدوں کی گود میں ادب پارے پرورش پانے لگے۔ اس کے بعد صورتِ حال یہ رہی کہ ملک کا کوئی بھی قابلِ ذکر شہر ایسا نہیں رہا جہاں سے رسالے شائع نہ ہوتے ہوں۔ ماضی کے اوراق میں جھانکیں تو نگار، شاہراہ، مخزن، ساقی اور اس نوع کے دیگر بہت سے رسائل نظر آئیں گے جنھوں نے اپنے عہد کو بڑی حد تک متاثر کیا اور اپنے عہد کے بہترین ادیبوں کی تخلیقات شائع کرکے انھیں ادبی دنیا میں ایک مقام عطا کیا۔ پھر 'بیسویں صدی'، 'تحریک' اور 'شب خون' جیسے رسالوں نے ایک طویل عرصے تک اہلِ ذوق کی ذہنی آبیاری کی۔ پھر ڈائجسٹ نے 'ہما'، 'شبستان' اور 'پاکیزہ آنچل' کی شکل میں قارئین کی ایک نئی دنیا آباد کی۔

لیکن اب پہلے کے مقابلے میں حالات بدل گئے ہیں۔ پہلے ذہنی تفریح کا ذریعہ صرف اخبارات و رسائل ہوا کرتے تھے، مگر آج صورتِ حال میں انقلابی تبدیلی آ گئی ہے۔ یہ انٹرنیٹ اور سائبر کا دور ہے، اسی کے ساتھ ساتھ یہ صارفیت کا بھی عہد ہے۔ بدلے ہوئے حالات نے جہاں بہت سی چیزیں بدل دی ہیں وہیں رسائل و جرائد پر بھی اس کا اثر پڑا ہے۔ اس عہد میں سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ کیا آج بھی رسالوں کی وہی معنویت اور اہمیت ہے جو پہلے تھی اور اسی کے ساتھ یہ سوال بھی اہم ہے کہ جو رسالے نکل رہے ہیں ان کا مستقبل کیا ہے؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے تو زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلے اور انفارمیشن ٹیکنالوجی سماجی ارتقا کی شہ رگ ہی کیوں نہ بن جائے، رسائل اور بالخصوص ادبی رسائل کی اہمیت اور معنویت ہمیشہ باقی رہے گی۔ یہ بات الگ ہے کہ ان کی تعدادِ اشاعت میں تخفیف ہو جائے لیکن بہرحال اس سے انکار ممکن نہیں کہ ادبی ذوق کی پرورش میں ان کا رول ہر دور میں مسلّم رہے گا کیوں کہ انسان کے، مادّی ضرورتوں کے حصار میں جکڑے رہنے کے باوجود اس کو ذہنی غذا کی بھی ضرورت ہوگی اور اس غذا کی فراہمی میں رسالے سب سے تیز اور موثر ذریعہ ہیں۔

جہاں تک مطبوعہ رسائل کی بات ہے تو انٹرنیٹ کے اس عہد میں ان کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے، لیکن اس معاملے کو ہم دوسرے نظریے سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ رسائل نے اپنا قالب بدلنا شروع کر دیا ہے اور اب پرنٹ رسائل کے مقابلے میں نیٹ رسائل کی تعداد میں نسبتاً زیادہ اضافہ ہو رہا ہے۔ گویا مطبوعہ شکل ڈیجیٹل شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ تاہم اس سے کوئی بھی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ مطبوعہ دور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس انقلاب آفریں دور میں بھی شائع ہونے والے رسالوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، جن میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں شامل ہیں۔ سرکاری رسائل کی تعداد کم ہے اور نجی رسائل کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ سرکاری ادبی رسالوں میں آجکل، اُردو دنیا، ایوانِ اردو، فکر و تحقیق، کتاب نما، بچوں کی دنیا، بچوں کا ماہنامہ امنگ (نئی دہلی)، نیا دور، خبرنامہ، سہ ماہی اکادمی (لکھنؤ)، زبان و ادب (پٹنہ)، روحِ ادب (مغربی بنگال) اور جمنا تٹ (چنڈی گڑھ) وغیرہ شامل ہیں۔ غیر ادبی سرکاری رسالوں میں افکارِ ملّی، یوجنا، سائنس کی دنیا اور سینک سماچار نئی دہلی سے نکلتے رہے ہیں۔ بیشتر سرکاری ادبی رسائل و جرائد ریاستی اردو اکیڈمیوں اور دوسرے سرکاری اداروں سے شائع ہوتے ہیں جب کہ پرائیویٹ رسائل و جرائد کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ان کی تعداد ڈیڑھ سو سے کم نہیں ہوگی، جن میں ذہنِ جدید، جامعہ، ادب ساز، جہانِ غالب، عالمی اردو ادب، بک ریویو، نئی کتاب، پیش رفت، رہنمائے تعلیم (دہلی)، شاعر، اثبات، نیا ورق، تکبیر، اور تحریرِ نو (ممبئی)، اسباق (پونہ)، فنون (اورنگ آباد)، امکان، گلبن، لاریب (لکھنؤ)، تمثیلِ نو اور جہانِ اردو، دربھنگہ ٹائمز (دربھنگہ)، انتخاب (گیا)، رنگ (دھنباد)، ثالث (مونگیر)، آمد (پٹنہ)، احساس (مالیگاؤں)، بزمِ ادب (علی گڑھ)، جوش بانی (الٰہ آباد)، مژگاں (کلکتہ)، انتساب (سرونج)، سرسبز (دھرم شالا، ہماچل پردیش)، ترویج (کٹک)، خوشبو کا سفر (حیدرآباد)، تمثیل (بھوپال)، اذکار (بنگلور)، نئی صدی (بنارس)، کہسار (بھاگلپور)، روزن (اڑیسہ)، ابجد (ارریہ)، ادیب انٹرنیشنل (لدھیانہ)، دبستان (کڈپہ)، عالمی ادبی گزٹ (مئوناتھ بھنجن) اور صدا (جمّوں و کشمیر) قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے بہت سے رسائل یا تو بند ہوگئے ہیں یا باقاعدگی سے نہیں نکل رہے ہیں۔

رسائل کی یہ فہرست بہت لمبی ہوسکتی ہے۔ تاہم یہ تعداد اس حقیقت کے اظہار کے لیے کافی ہے کہ انٹرنیٹ کے اس دور میں بھی رسالوں اور جریدوں کی اہمیت باقی ہے اور آئندہ بھی باقی رہے گی۔ البتہ ادبی رسائل کے بارے میں بعض ادیبوں اور نقادوں کی رائیں بدل رہی ہیں۔ کچھ لوگ اس رائے کے حامی نظر آتے ہیں کہ موجودہ عہد میں جو کہ صارفیت کا عہد ہے، مطبوعہ رسائل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے خیال میں مستقبل انٹرنیٹ کا ہے اس لیے وہی رسالہ زندہ رہے گا جس کی رگوں میں 'سائبر لہو' دوڑ رہا ہوگا، لیکن ایسے بھی لوگ ہیں جو اس بات سے اتفاق نہیں رکھتے۔ البتہ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اگر ادبی رسالوں کو بھی عہدِ صارفیت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا جائے تو ان کی بقا کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ بہت سے پرانے اور اچھے رسائل بند ہوگئے ہیں یا بند ہوتے جا رہے ہیں، لیکن اس کے متوازی یہ بھی ایک سچائی ہے کہ بہت سے نئے نئے رسالے بھی منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔ ہاں وہ رسالے ضرور بہت جلد دوم توڑ دیتے ہیں جو یا تو سرمایے کی آکسیجن کے بغیر نکلتے ہیں یا جن کی سوچ فرسودہ ہوتی ہے اور جو زمانے کے تقاضے کے مطابق نئے نئے تجربات سے گزرنے سے خوف کھاتے ہیں۔ جو رسائل سماج کی بدلتی سوچ اور بدلتے معیار کو سامنے رکھتے ہیں اور اس کے مطابق اپنی روش طے کرتے ہیں اُن کے لیے بقا کا مسئلہ اتنا سنگین نہیں ہے جتنا کہ منجمد اور فرسودہ سوچ والے رسائل کا ہے۔ جو رسائل ادب میں نئے نئے مباحث کے دروازے کھولتے ہیں اور نئے ادبی ڈسکورس سے قارئین کو متعارف کراتے ہیں وہ تادیر زندہ رہتے ہیں۔ آخر انہی رسائل کے صفحات پر کرشن چندر، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو اور دوسرے بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے اپنے بال و پَر کھولے اور وہی صفحات ان کے لیے نئی دنیاؤں میں پرواز کرنے کا لانچنگ پیڈ ثابت ہوئے۔ آج اس قسم کے رسالے بھی بند ہونے کے باوجود زندہ ہیں اور وہ ادیب و شاعر بھی دنیا سے چلے جانے کے باوجود سماج کے ذہنوں میں اپنی زندگی کا ثبوت دے رہے ہیں۔

اس تعلق سے ماہنامہ 'رہنمائے تعلیم آف لاہور' کا ذکر ضروری ہے کہ اس نے 105 سال کی عمر پائی۔ اسے سردار جگت سنگھ نے 1905 میں پاکستان کے پنڈی گھیب سے شروع کیا تھا۔ یہ 1947 تک لاہور سے نکلتا رہا۔ تقسیمِ وطن کے بعد سردار جگت سنگھ اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ دہلی آگئے اور یہاں سے انھوں نے اسے 1947 سے نکالنا شروع کیا۔ 1962 میں ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے سردار ہربھجن سنگھ تھاپر اسے نکالتے رہے۔ انھوں نے اس رسالے کی عمر ایک صدی سے اوپر پہنچا دی۔ وہ اپنی عمر کے آخر وقت تک اس کے مدیر رہے۔ 2006 میں ان کے انتقال کے تین مہینے بعد یہ رسالہ بند ہوگیا۔ البتہ 'رہنمائے تعلیم جدید' کے نام سے ایک دوسرا رسالہ 'ابونعمان' 2006 سے ...(بقیہ صفحہ 7 پر)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
معاون مدیران : منور حسن کمال، سالم فاروق ندوی
Assisistant Editors :
Munawwar Hasan Kamal, Salim Farooq Nadwi
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-۶
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***